© rasailojaraid.com

عدل وقضا

پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر☆

عدل کا مفہوم، شرعی تصور اور تاریخی ارتقا

عدل مصدر ہے، اس کا مادہ ع د ل ہے، اس مادے میں برابری اور مساوات وانصاف کا مفہوم ہے۔ لسان العرب میں ہے: "عدل ، إنه مستقیم وھو ضدّ الجور ، العدل: من أسماء اللهِ ھو الذي لا یمیل به الھوٰی ، العدل الحکم بالحق"[1]

"عدل، اس کا معنی سیدھا ہے اور یہ جور کی ضد ہے۔ عدل لفظ اللہ کے ناموں میں سے ہے یعنی وہ خواہشات کی طرف مائل نہیں ہوتا، عدل حق کے ساتھ فیصلہ کرنے کو کہتے ہیں۔"

◉ امام جرجانیؒ کا کہنا ہے: "العدل الأمر المتوسط بین الإفراط والتفریط"[2]

"عدل اِفراط وتفریط کے درمیان متوسط کام کو کہتے ہیں۔"

ایڈورڈ ولیم لین کے مطابق اُمور ومعاملاتِ قضا میں درست اور برابری کا رویہ اختیار کرنے کو عدل کہتے ہیں۔[3] عدل کے مختلف معنوں میں سے ایک معنی 'برابر' اور یکساں بھی ہیں۔[4] جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿أَوْ عَدْلُ ذَٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهِ﴾[5]

"یا اس کے برابر روزے رکھے تاکہ اپنے کیے کی سزا چکھے۔"

عَدَل (بالفتح) کے معنی قیمت، فدیہ، مرد صالح اور حق وانصاف کے ہیں۔[6]

◉ عدل 'فدیہ' کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔[7] اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے:

☆ ڈائریکٹر مسندِ سیرت، دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور

① ابن منظور، ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم، لسان العرب (دارِ صادر، بیروت) ۱۱/۴۳۰

② صدیقی، محمد عبدالحفیظ، برصغیر پاک وہند میں اسلامی نظامِ عدل (ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد) ص ۹

③ (i) Edward William Lane, An Arabic English Lexicon, 1/1972;
(ii) Hans Wehr A Dictionary of Modern Written Arabic, p.596

④ دکتور إبراھیم ورفقائه، المعجم الوسیط (مکتبہ علمیہ، تہران) ۲، ۱/۵۸۸

⑤ المائدۃ: ۹۵ ⑥ ابوالفضل، جمال الدین احمد بن مکرم، لسان العرب (دارِ صادر، بیروت) ۹/۸۳

⑦ الازہری، ابومنصور بن احمد، معجم تہذیب اللغہ: ۳/۲۳۵۸؛ الجوہری، الصحاح (دار الکتب العربی، مصر) ۴/۱۴۳۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ﴾ [8]

''اور نہ کسی کی سفارش منظور کی جائے گی اور نہ کسی سے کسی طرح کا بدلہ قبول کیا جائے گا۔''

⦿ لیکن اگر عدل بالکسرہ ہو تو اخفش کے مطابق اس کے معنی 'المثل' کے ہیں۔ [9]

⦿ اہل لغت نے اگرچہ العَدل اور العِدل کے معنی الگ الگ لیے ہیں، لیکن اس سلسلے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ قریب المعنی ہیں۔ عَدل معنوی چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور عِدل ان چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے جن کا اِدراک حواسِ ظاہرہ سے ہوتا ہے۔ [10]

⦿ عدل اصل میں عربی لفظ ہے۔ اُردو میں اس کا ہم معنی 'انصاف' انگریزی میں "Justice" اور عبرانی میں صداقاة اور مشپاط ہے۔

⦿ Twentieth Century Encyclopaedia میں Justice کے ضمن میں مقالہ نگار لکھتا ہے:

> Equal distribution of right in expressing opinions; fair representation of facts respecting merit or demerit: equity, impartiality.[11]

⦿ The Standard Jewish Encyclopedia کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

> The Biblical Hebrew words for Tzedek, Tzedakah, Mishpat possess many shades of meaning, Justice, righteousness, proper behaviour, fairness, integrity.[12]

⦿ اُردو زبان میں 'عدل' کو بطورِ اسم ذات بھی استعمال کیا جاتا ہے اور بطورِ اسم صفت بھی، اس صورت میں اس کے معنی ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے:

''اسم ذات کے طور پر عدل کے معنی 'انصاف' یا 'دادرسی' کے ہیں اور اسم صفت کے طور پر اس کے معنی مستقیم، منصفانہ اور متوازن کے آتے ہیں۔'' [13]

⦿ جب کہ عام اصطلاح اور قضا کے نقطۂ نظر سے عدل کا مفہوم یہ ہے:

---

(8) البقرۃ:۴۸

(9) کتاب العین، ۶۰۹؛ الجوہری، الصحاح، ۴/۱۴۳۶؛ رازی، ابوبکر، مختار الصحاح (مطبعہ امیریہ بولاق) ۲۵۱

(10) راغب اصفہانی، مفردات القرآن (مکتبہ مرتضویہ لاحیاء الآثار الجعفریہ) ۳۲۵؛ معجم تہذیب اللغۃ: ۲۳۵۸/۳

(11) Charles Smith, Twentieth Century Encyclopaedia, 4/173

(12) Cecil Roth, The Standard Jewish Encyclopedia, 1084.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''روزمرہ معاملات میں لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے ہوئے جج یا قاضی عدل وانصاف کے ساتھ ان کے حقوقِ عامہ کا یوں تحفظ کرے کہ کسی ایک کی بھی حق تلفی نہ ہو۔''

''عدل کو عربی زبان میں 'قضاء' کہتے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں قضا کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کے معینہ ادارے کی طرف سے قرآن وسنت اور شرعی احکام کی روشنی میں عامۃ الناس کے باہمی تنازعات کا تصفیہ کیا جائے اور مقدمات فیصل کیے جائیں۔''[۱۳]

◉ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

''سیاستِ شرعیہ کی عمارت دو ستونوں پر قائم ہے۔ ایک ہے مناصب اور عہدے اہل تر لوگوں کو دینا اور دوسرا ہے عدل وانصاف کے ساتھ فیصلے کرنا۔ انصاف ہی پر دنیا ودین کی فلاح کا دارومدار ہے اور بغیر عدل کے فلاحِ دارین کا حصول ناممکن ہے۔''[۱۵]

◉ امام فخر الدین رازیؒ کہتے ہیں:

''العدل فهو عبارة عن الأمر المتوسط بين طرفي الإفراط والتفريط، وذلك أمر واجب الرعاية في جميع الأشياء''[۱۶]

مندرجہ بالا تعریفات کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ عدل کا مفہوم مختلف مناسبتوں سے مختلف ہوتا ہے۔ عدل کا ایک مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنے ربّ کے درمیان عدل کرے، یعنی اللہ کے حق کو اپنی خواہش پر مقدم رکھے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اپنی ذات کے ساتھ عدل کرے، یعنی اپنے نفس کو ایسی تمام باتوں اور چیزوں سے بچائے رکھے جن سے جسمانی وروحانی ہلاکت واذیت کا خطرہ ہو اور تیسرا مفہوم یہ ہے کہ اپنی ذات اور مخلوق کے درمیان عدل کرے یعنی تمام مخلوقات سے ہمدردی وخیر خواہی کا برتاؤ کرے۔ ہمارے ہاں عدل کو عدالت کے ساتھ منسلک کردیا گیا ہے۔

عدل وانصاف کی اہمیت وضرورت قرآن وحدیث کی روشنی میں

معاشرے میں استحکام پیدا کرنے کے لیے عدل وانصاف اور سزا نہایت ضروری ہیں۔ اس کے بغیر معاشرہ جرائم اور منکرات سے پاک نہیں ہوسکتا۔ معاشرے کو برائیوں سے مبرا رکھنے

---

۱۳. اُردو دائرہ معارف اسلامیہ (شعبہ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور) ۱۳/۴

۱۴. ابن تیمیہ، شیخ الاسلام، السیاسۃ الشرعیۃ (جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ) ص ۷

۱۵. صالح بن عبد اللہ وعبد الرحمٰن، نضرۃ النعیم (دار الوسیلہ، سعودی عرب) عنوان: العدل والمساوات: ۲۷۹۲/۷

۱۶. رازی، فخر الدین، مفاتیح الغیب: ۱۰۵/۲۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے قانون وعدل نہایت ضروری ہیں۔ عدل کے بغیر، جس کی بنیاد قانون پر ہوتی ہے، امن وامان قائم نہیں رہ سکتا، اس لیے اسلام نے ایسے جرائم میں حد مقرر کی جس کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے جیسے چوری، زنا، قتل وغارت گری، لوٹ مار اور شراب نوشی وغیرہ اور انصاف اور سزا کا اختیار صرف ان لوگوں کو دیا جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہو۔ قانون کے نفاذ سے جرائم کا انسداد ضروری ہوجاتا ہے اور معاشرہ کسی حد تک جرائم سے پاک بھی ہوجاتا ہے۔ (۱۷)

❁ اللہ تعالیٰ نے ہر معاملے میں عدل قائم کرنے پر زور دیا ہے۔ اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے: ﴿وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ (۱۸)

''مجھے تمہارے درمیان انصاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔''

﴿وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾ (۱۹)

''اور جب بھی تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔''

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ (۲۰)

''اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث عدل کو ہرگز نہ چھوڑو، عدل کرو یہی تقویٰ کے بہت زیادہ قریب ہے۔''

﴿وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ﴾ (۲۱)

''اور اگر تو فیصلہ کرے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کر۔''

﴿قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ﴾ (۲۲) ''کہہ دے کہ میرے رب نے مجھے انصاف کا حکم دیا ہے۔''

❁ احادیث میں بھی عدل کی بہت زیادہ اہمیت پائی جاتی ہے۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«فإن عدلوا فلأنفسهم ، وإن ظلموا فعليها» (۲۳)

''اگر وہ انصاف کریں تو ان کے لیے فائدہ مند ہے، اگر ظلم کریں تو ان کے لیے وبالِ جان۔''

حضرت ابن عباسؓ اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا﴾ (۲۴) (مگر جس نے توبہ کی، ایمان لایا اور نیک کام کیے) کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ میں نے اس آیت کے بارے میں نبی ﷺ سے سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مکہ والوں نے کہا:

---

(۱۷) مقالاتِ سیرت، حصہ اوّل (نویں قومی سیرت کانفرنس، وزارتِ اُمورِ مذہبی حکومت پاکستان، اسلام آباد) پروفیسر عبداللطیف انصاری، اسلام کے قانونی نظام کے بنیادی اُصول، ص ۱۰۱

(۱۸) الشوریٰ: ۱۵ (۱۹) النساء: ۵۸ (۲۰) المائدۃ: ۸ (۲۱) ایضاً: ۴۲

(۲۲) الاعراف: ۲۹ (۲۳) ابوداؤد، السنن (دارالسلام، الریاض ۱۹۹۸ء) ص ۲۳۵، حدیث نمبر ۱۵۸۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"فقد عدلنا بالله، قتلنا النفس التي حرّم الله إلاّ بالحقّ و أتينا الفواحش فأنزل الله ﴿إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا﴾"[25]

''پس ہم نے اللہ کے معاملے میں انصاف کیا اور اُس نفس کو قتل کیا جس کو اللہ نے حق کے ماسوا قتل کرنا حرام کیا، اور ہم نے فحش کام کیے پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا﴾''

لوگوں کے درمیان اصلاح کروانے اور ان کے درمیان انصاف کرنے والے کے بارے میں نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

«يعدل بين الناس صدقة»[26] ''لوگوں کے درمیان انصاف کرنا صدقہ ہے۔''

حکمران کے بارے میں حدیث میں آتا ہے:

«فإذا عدل كان له الأجر»[27] ''جب وہ عدل کرے تو اس کے لیے اجر ہے۔''

عدل وانصاف کے اُصول

محسنِ انسانیت ﷺ نے ایک طرف تو جرم کی سزا کی تنفیذ کی سختی سے تاکید فرمائی تو دوسری طرف آپس کے معاملات میں جن کا تعلق انفرادی زندگی سے تھا، عفو و درگزر کی تعلیم دے کر معاشرہ میں جماعت اور افراد دونوں کو استحکام بخشا اور نظامِ عدل کو ایسے بنیادی اُصولوں سے نوازا جو عالمگیر اہمیت کے حامل ہیں۔

❶ **اصل قانون ساز اللہ تعالیٰ:** ربّ کائنات ہی حکمرانِ حقیقی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن کریم میں متعدد بار بیان کیا گیا اور اتنے زور کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے زیادہ پُرزور الفاظ کسی بات کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے استعمال نہیں ہو سکتے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ﴾[28]

''حکم اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں، اس کا فرمان ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی اور اطاعت نہ کرو، یہی صحیح طریقہ ہے۔''

❷ **قانون سازی میں رسول اللہ ﷺ کی حیثیت:** نبی کریم ﷺ نے بطورِ منصف انسانیت

---

(۲۴) الفرقان: ۶۰ (۲۵) بخاری، جامع صحیح (دارالسلام، الریاض ۱۹۹۸ء) ص ۸۳۵، حدیث ۴۷۶۵

(۲۶) ایضاً ص ۴۴۲، حدیث نمبر ۲۷۰۷

(۲۷) خطیب تبریزی، مشکوۃ المصابیح (مکتبہ تجاریہ، دارالفکر، بیروت ۱۹۹۱ء) ۳۴۲/۲، حدیث نمبر ۳۷۱۸

(۲۸) یوسف: ۴۰ (۲۹) النجم: ۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے عظیم اُسوۂ حسنہ چھوڑا ہے۔ قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ اس نے نبی ﷺ کو قاضی مقرر کیا ہے، کیونکہ آپؐ اللہ کی جانب سے صرف حق بات ہی کہتے ہیں جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے: ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ﴾ (۲۹)

''اور وہ جو کچھ کہتا ہے ہوائے نفس کی بنا پر نہیں کہتا۔''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إني لا أقول إلا حقًا» (۳۰) ''میں فی الواقع حق کے سوا کچھ نہیں کہتا۔''

نبی ﷺ بطورِ منصف کی تصدیق مندرجہ ذیل احادیث سے ہوتی ہے:

عن علي قال: لما نزلت: ﴿وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ قالوا: يارسول الله! أفي كل عام؟ فسكت فقالوا: يارسول الله! أفي كل عام؟ قال: «لا، ولو قلتُ: نعم، لوجبت» فأنزل الله تعالىٰ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِن تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ﴾ (۳۱)

''جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ تو لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! کیا ہر سال (حج کرنا) فرض ہے؟ تو حضور خاموش رہے۔ لوگوں نے پھر عرض کیا: کیا ہر سال؟ یارسول اللہ ﷺ! تو آپؐ نے فرمایا: نہیں۔ اور اگر میں کہہ دیتا 'ہاں' تو ہر سال حج واجب ہو جاتا۔''

مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے مقدمات میں اللہ سے انصاف طلب کریں۔ اللہ سے انصاف طلب کرنے سے مراد یہ کہ اس کے رسول ﷺ کو مقدمات اور تنازعات کا فیصلہ کرنے کے لیے جج تسلیم کیا جائے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾ (۳۲)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول اور جو تم میں حکمران ہیں، ان کا حکم مانو۔ پھر اگر تم میں کسی بات کا جھگڑا اُٹھے تو اسے اللہ اور رسول ﷺ کے حضور لوٹا دو، اگر اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے۔''

اس آیتِ مبارکہ میں حضور ﷺ کو سب سے بڑا انتظامی اور عدالتی اختیار تفویض کیا گیا

---

(۳۰) ترمذی، السنن (مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ۱۹۵۴ء) کتاب البر، باب ماجاء فی المزاح، ۳۵۱/۴

(۳۱) ایضاً، کتاب الحج، باب ماجاء کم فرض الحج، ۱۷۸/۳ (۳۲) النساء: ۵۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ حضور ﷺ کے احکامات اور فیصلوں کی اطاعت حکم الٰہی اور ایک مسلمان کے ایمان کی نشانی بھی ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک مسلمان منافق اور ایک یہودی کے درمیان جھگڑا ہوا تو مسلمان منافق نے کہا: چلو کعب بن اشرف سے فیصلہ کرائیں گے۔ یہودی نے کہا: نہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس چلو، ان سے فیصلہ کرائیں گے۔ وہ مسلمان منافق (مجبوراً) آمادہ ہوگیا اور دونوں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا مقدمہ پیش کیا۔ حضور ﷺ نے (فریقین کے بیانات سن کر) یہودی کے حق میں فیصلہ فرمادیا۔ اس منافق مسلمان نے رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کو ماننے سے انکار کردیا اور کہا: چلو حضرت عمرؓ سے فیصلہ کرائیں۔ سو دونوں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پورا قصہ بیان کیا۔

حضرت عمرؓ نے اس منافق مسلمان سے پوچھا: کیا یہ سچ کہتا ہے، واقعہ یہی ہے؟ منافق نے کہا: ''ہاں ٹھیک ہے، ہاں ٹھیک ہے۔'' تو حضرت عمرؓ نے کہا: ''تم ذرا ٹھہرو، میں ابھی آکر فیصلہ کرتا ہوں۔'' اور گھر میں سے برہنہ تلوار لے کر آئے اور منافق کی گردن اُڑادی اور فرمایا: ''جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلے کو قبول نہ کرے، میں اس کا فیصلہ اسی طرح کیا کرتا ہوں۔'' روایات میں ہے کہ اسی وقت حضرت جبرائیلؑ آپ ﷺ کے پاس آئے اور فرمایا کہ عمرؓ نے حق اور باطل کے درمیان فرق کردیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی واقعہ پر طاغوت کے مقابلہ پر حضرت عمرؓ کا نام 'فاروق' رکھ دیا۔[۴۲]

۴ مجلس شوریٰ: جدید علم سیاست میں جس ادارے کو مقننہ یا قانون ساز ادارہ کہا جاتا ہے علومِ اسلامیہ کی اصطلاح میں اس کو اہل حل وعقد بھی کہا جاتا تھا۔ اسلام میں مجلس شوریٰ یا مقننہ صرف ان مسائل ومعاملات کے سلسلہ میں قانون وضع کرنے کی مجاز ہوگی جن کے بارے میں قرآن وسنت میں واضح احکام موجود نہ ہوں۔ یہ قانون سازی جس طرح عام نہ ہوگی، اسی طرح آزاد بھی نہ ہوگی، بلکہ دین کے مزاج اور شریعت کی مقررہ حدود کے تحت ہی ہوگی۔ صرف کتاب وسنت کے واضح احکام کو سامنے رکھ کر انہی کی بنیاد پر کی جائے گی، علاوہ ازیں چونکہ یہ ذیلی قانون سازی شریعت کے احکامات کو پیش نظر رکھ کر ہی عمل میں لائی جائے گی، اس لئے اس مجلس شوریٰ کے اراکین بھی شریعت اسلامیہ کے ماہر ہوں گے:

عن علي قال: سئل رسول عن العزم قال مشاورة أهل الرأي ثم اتباعهم[۴۳]

---

۴۲ آلوسی، تفسیر روح المعانی (ادارہ طباعہ منیریہ، قاہرہ) ۵/۶۷

۴۳ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم (مکتبہ مالکیہ، مصر) ۱/۴۲۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''حضرت علیؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ سے عزم کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اہل الرائے سے مشورہ کرنا اور پھر ان کی پیروی کرنا۔''

❹ **تعزیرات کا نفاذ:** فوجداری جرائم کی سزائیں ایسی صورت حال میں نافذ کرنی چاہئیں، جب معاشرہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا خاطر خواہ اہتمام موجود ہو اور حالات معمول پر ہوں۔ جب تک معاشرہ میں نفاذِ اسلام کے لیے سازگار حالات پیدا نہ کردیئے جائیں یا یہ کہ حالات ایسے غیر معمولی ہوں جن میں ارتکاب جرم کے محرکات ترقی پذیر ہوں تو سزاؤں کی کے نفاذ سے پہلے جرم کی روک تھام پر توجہ دینا ضروری ہے۔ چنانچہ خاص جنگی یا غیر معمولی حالات میں سزاؤں کے وقتی التوا کی گنجائش بھی موجود ہے جیسا کہ قحط کے زمانے میں خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے وقتی طور پر چوری کے لیے قطع ید کی سزا التوا میں ڈال دی تھی۔

❺ **شریعتِ الٰہی کے مطابق فیصلہ:** مفتی و قاضی پر لازم ہے کہ وہ صرف قانونِ الٰہی یعنی قرآن اور سنت کے مطابق فیصلہ کرے اور عدل و انصاف سے کام لے۔ عدل و انصاف سے فیصلہ کرنے کا حکم کسی کی خواہشات پر چلنے کی کلی نفی کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت اس آیت میں فرمادی: ﴿وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾[۳۵]

''اور اپنے آپس میں اپنے مالوں کو ناحق نہ کھاؤ، اور ان کو حکام کی طرف ڈالو، تاکہ تم گناہ کے ساتھ لوگوں کے مال کا ایک حصہ کھا جاؤ اور تم تو جانتے ہو۔''

عدل میں حرص یا خواہشات کا خواہ وہ اپنی ہو یا کسی اور کی، کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے اور حاکم کو شہادتوں کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے۔

نظامِ عدل کی ضرورت اور تاریخی ارتقا

نظامِ عدل کی بنیاد کب اور کس نے ڈالی اور ابتدائی دور کا نظامِ عدل کیسا تھا؟ اس بارے میں واضح بات یہی ہے کہ پہلے انسان حضرت آدم کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کا سلسلہ شروع کردیا اور انسان نے جب سے معاشرتی زندگی کا آغاز کیا، اسی دن سے انصاف کے اُصولوں کو اپنانے کی کوشش شروع کردی۔

پہلا جھگڑا حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کے درمیان ہوا تھا، ایک نے دوسرے

---

۳۵ البقرۃ:۱۸۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو قتل کر کے انصاف حاصل کرنے کی کوشش کی۔ انبیاے کرامؑ کی لائی ہوئی وحی کے ساتھ ساتھ لوگوں کی بے پروائی اور اللہ کے نظام سے انکار بھی ایک مسلمہ حقیقت رہی ہے چنانچہ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ عدل کا باضابطہ نظام آہستہ آہستہ معاشروں میں ترقی حاصل کرتا رہا۔ جیسا کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ

''قدیم زمانے میں انسان اپنے نزاع کا تصفیہ ذاتی طاقت اور قوت کے استعمال سے کرتا تھا۔ اور ذاتی انتقامی کاروائی انصاف کے خلاف استعمال ہوتی تھی۔'' [۳۶]

''ابتدائی زمانہ میں جب انسان کی طرزِ معاشرت وحشیانہ تھی اور منظم و منضبط حکومتوں کا قیام نہیں ہوا تھا، ستم رسیدہ اور متضرر اشخاص اپنا انتقام آپ لیا کرتے تھے اور اگر ایک شخص کی دوسرا حق تلفی کرتا تو دوسرا اپنے حق کو بچانے کے لیے جنگ و جدل اور دھینگا مشتی سے اپنی آپ مدد کرتا تھا۔ بعض وقت ضرر رسیدہ کے قرابت دار اور احباب بھی اس کے دشمنوں سے انتقام لینے میں اس کے شریک ہو جاتے تھے۔'' [۳۷]

ایک زمانے میں مظلوم اپنی مدد آپ کر سکتا تھا، پھر وہ دور آیا کہ اس حق پر کچھ پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ پھر زمانہ بدلا اور حق لینے کے لیے صاحبِ رسوخ کی زیر نگرانی ڈوئل (Dual) لڑنے کا رواج متعارف ہوا۔ پھر وہ وقت آیا کہ تنازعات کو ثالثوں اور پنچائتوں کے سپرد کرنے کا رواج چل نکلا۔ لیکن جب سلطنتیں مضبوط اور مستحکم ہو گئیں تو اُنھوں نے باقاعدہ عدالتیں قائم کر دیں جو انصاف کرنے کے معاملے میں فرمانروا کی نمائندہ قرار دی گئیں اور اس طرح نظامِ معدلت وجود میں آ گیا۔

تاریخ کے مطالعے سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ نظامِ عدل کا قیام حکومتوں اور سلطنتوں کی مضبوط مستحکم قوت کی بنا پر معرضِ وجود میں آیا۔ نظامِ معدلت کو قائم کرنے کے لیے ایک مضبوط اور پائیدار حکومت کا ہونا ضروری ہے۔ تمام اربابِ خیر فطری طور پر اپنے معاملات ایسے رہبر کے سپرد کر دینا چاہتے ہیں جو اُنھیں ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے روکے اور مخاصمت باہمی میں ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ اگر ذی اقتدار افراد نہ ہوں تو عالم میں شخصی انارکی پھیل جائے اور تہذیبِ اجتماع کا شیرازہ بکھر جائے۔ [۳۸]

---

۳۶ رضوی، اظہار حیدر: 'اصولِ قانون'، (مکتبہ فریدی اُردو کالج، کراچی) ص ۱۱۲

۳۷ سالمنڈ، 'اصولِ قانون' (دار الطبع عثمانیہ، حیدر آباد دکن، ۱۹۲۵ء) ص ۹۱

۳۸ الماوردی: ''الاحکام السلطانیہ'' (ترجمہ سید محمد ابراہیم مطبع جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن، اشاعت ۱۹۳۱ء) ص ۱۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی رہبر اور حاکم کی طرف قرآنِ مجید میں اشارہ فرمایا گیا:

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾[39]

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور اپنے حکمرانوں کی۔ پھر اگر تم میں کسی بات کا جھگڑا اُٹھے تو اسے اللہ اور رسول ﷺ کے حضور رجوع کرو، اگر اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔''

جیسے جیسے تہذیب نے ترقی کی، عدل کی ضرورت بھی بڑھتی گئی اور دنیا کے نظامِ عدل میں ترقی اور جدتیں بھی پیدا ہوتی گئیں اور آج ہمارے سامنے دنیا بھر میں جو نظامِ عدل قیام فرما ہے، وہ جہاں تہذیب کے تمام تر تجربات کا نچوڑ ہے، وہاں اللہ کے دیے ہوئے نظام عدل سے بھی اس میں بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ بہرحال اسلام کی رو سے تو کسی بھی نظام عدل کی اساس اللہ تعالیٰ کی محکم شریعت ہی ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں اس الہامی اساس کو چھوڑ کر جو بھی نظام عدل آج تک متعارف کرایا گیا ہے، وہ اپنی تمام تر ترقی کے باوجود انسان کو مطلوبہ امن وانصاف فراہم کرنے سے عاجز رہا ہے۔ اور یہ سوال آج بھی نمایاں طور پر موجود ہے کہ اپنے آپ کو مہذب کہلانے والی دنیا کا نظام عدل کیا مہذب کہلانے کا مستحق ہے اور کیا اس سے انسانیت امن وآشتی کے دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کرسکے گی؟

اسلامی عدل وانصاف کا اِرتقا

اسلام میں سب سے پہلے قاضی خود رسول اللہ تھے جنہوں نے عدل کا بول بالا کیا۔ نبی ﷺ کے عدالتی طریق کار کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کا عہدِ قضا آتا ہے، ان کا معمول یہ تھا کہ

''اگر کتاب وسنت سے کوئی نظیر نہیں ملتی تھی تو وہ باہر تشریف لے جاتے اور مسلمانوں سے کہتے کہ میرے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے، کیا تم جانتے ہو؟'' وہ اس کے بارے میں جو بات کہتے ان سے مشورہ کرکے قرآن وسنت کی روشنی میں فیصلہ کرتے۔''[40]

سیدنا ابوبکرؓ کے عہد میں عدلیہ اور انتظامیہ کو 'شریعت کی حکمرانی' کا دور قرار دیا جاسکتا ہے۔

---

(39) النساء:۵۹

(40) جعفری، رئیس احمد: 'سیاست شرعیہ' (ادارۂ ثقافت اسلامیہ، پاکستان، لاہور، پہلا ایڈیشن ۱۹۵۹ء، ص ۱۲۷، ۱۲۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عہدِ فاروقیؓ

حضرت عمرؓ نے بھی حضرت ابوبکرؓ والا اُصول اپنایا کہ پہلے قرآن وسنت سے مسئلے کا فیصلہ ڈھونڈتے تھے۔ اس کے بعد دیکھتے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اس کے بارے میں کیا فیصلہ ہوچکا ہے؟ اگر معلوم ہوجاتا تو حضرت ابوبکرؓ کے فیصلہ کو نافذ کردیتے، ورنہ وہ بھی اہل حل وعقد کو جمع کرتے اور باہمی مشاورت سے جو فیصلہ ہوتا، اس کو نافذ کردیا جاتا۔

قواعدِ عدالت کے متعلق حضرت عمرؓ کی ایک تحریر کتب تاریخ میں محفوظ ہے جو یوں ہے:

''خدا کی تعریف کے بعد قضا ایک ضروری فرض ہے۔ لوگوں کو اپنے سامنے اپنی مجلس میں اپنے انصاف میں برابر رکھو تاکہ کمزور انصاف کے حصول میں مایوس نہ ہو اور تمہاری رعایت کی اُمید نہ پیدا ہو۔ جو شخص دعویٰ کرے، اس پر بارِ ثبوت ہے اور جو شخص منکر ہو اس پر قسم صلح جائز ہے بشرطیکہ اس سے حرام حلال اور حلال حرام نہ ہوجائے۔ کل اگر تم نے کوئی فیصلہ کیا تو آج غور کے بعد اس سے رجوع کرسکتے ہو۔ جس مسئلے میں شبہ ہو اور قرآن وحدیث میں اس کا ذکر نہ ہو تو اس پر غور کرو اور پھر غور کرو اور اس کی مثالوں اور نظیروں پر غور کرو۔ پھر قیاس کا رستہ اپناؤ۔ جو شخص ثبوت پیش کرنا چاہے تو اس کے لیے ایک میعاد مقرر کرو، اگر وہ ثبوت دے تو اس کا حق دلاؤ، ورنہ مقدمہ خارج کردو۔ مسلمان سب ثقہ ہیں، سوائے اُن اشخاص کے جن کو حد کی سزا میں درّے لگائے گئے ہوں یا جنھوں نے جھوٹی گواہی دی ہے، یا وِلاء اور وراثت میں مشکوک ہوں۔''(۴۱)

حضرت عمرؓ کے دور میں قاضی (جج) کا تقرر ایک مستقل ادارے کی صورت اختیار کرگیا تھا اس کو دیگر خلفاے راشدین نے بھی جاری رکھا۔ اس نظام میں عامل کو قاضی کے ماتحت رکھا گیا تھا تاکہ وہ اس کے اثر سے آزاد ہوکر عدل کرسکے۔ قاضی کو تمام بیرونی اثرات سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ ہر صوبے میں قاضی کا تقرر ہوتا تھا۔ صوبائی گورنر کو قاضی کا کوئی اختیار نہیں دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہر ضلع میں چھوٹے قاضی بھی موجود تھے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں قاضیوں کو تنخواہیں دی جانے لگیں تاکہ وہ اپنی زندگی بآسانی گزار سکیں اور لالچ میں مبتلا نہ ہوں۔(۴۲)

---

(۴۱) شبلی نعمانی، الفاروق سوانح عمری حضرت عمرؓ (مکتبہ رحمانیہ، لاہور) ص ۲۲۰

(۴۲) راشدہ شعیب، اسلامی نظام حکومت (بک پروموٹرز، اسلام آباد، طبع اول ۱۹۹۵ء) ص ۱۸۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دورِ عثمانؓ بن عفان

حضرت عثمانؓ ایک نرم دل خلیفہ تھے۔ حضرت عمرؓ نے عدل گستری سے متعلق جو اوصاف ضوابط طے کیے، وہ ان کے زمانے میں بھی بحال رہے۔ ان کے زمانے میں ایک عمارت 'دارالقضاء' کے نام سے بنائی گئی جس میں عدل سے متعلق معاملات انجام دیے جاتے تھے۔[۴۳]

سیدنا علیؓ کا دور

عدلیہ کی جو حیثیت اور شان ووقعت حضور ﷺ کے عہد میں اور پھر تینوں خلفائے راشدین کے عہد میں تھی، وہ حضرت علیؓ کے عہد میں بھی باقی رہی۔ قضا کے باب میں سیدنا علی اپنی مثال میں یکتا تھے۔ سراجِ نبوت سے ہر صحابیؓ نے کسبِ فیض کیا اور سب کے الگ الگ رنگ ہیں۔ حضرت مرتضیٰؓ کو اللہ نے کارِ قضا میں ممتاز بنایا اور زبانِ رسالت ﷺ سے «أقضاهم علي» کا اعزاز اُنہیں ملا۔ کتنی گتھیوں کو اُن کی ذہانت نے سلجھایا۔ سیدنا علیؓ کا قاضی شریحؒ کی عدالت میں حاضر ہوکر ایک یہودی کے خلاف انصاف چاہنا اور قاضی شریح کا امیر المومنین کے خلاف ایک یہودی کے حق میں فیصلہ دینا اسلامی تاریخ کا معروف واقعہ ہے۔[۴۴]

حضرت علیؓ نے اپنے دورِ خلافت میں نظام عدل کو بھی بہت ترقی دی اور ان کے فیصلے اسلامی نظامِ عدل میں اعلیٰ نظیر کا درجہ رکھتے ہیں۔ گواہی دینے سے متعلق آپؓ نے جو فیصلے کیے ہیں، ان میں جھوٹی گواہی دینے پر شہر بھر میں تشہیر کرنے کے بعد قید کی سزا اور یہ بھی کہ کسی قضیہ کا فیصلہ ایک گواہ پر بھی ہوسکتا ہے۔ ایسے ہی چار عادل گواہ اگر خود متہم ہوں تو ان چاروں پر حد لگے گی۔ اُنہوں نے نکاح میں عورتوں کی گواہی جائز قرار دی، لیکن طلاق میں نہیں۔ ان کے مطابق دشمن کی گواہی کو تسلیم نہیں کیا۔

حضرت علیؓ نے عہدۂ خلافت کے ساتھ ساتھ عہدۂ قضا کو بھی بخوبی انجام دیا۔ ان کے فیصلے تاریخ میں روشن مثالیں ہیں۔

اُموی اور عباسی عہد میں نظامِ عدل

ابتدا میں خلفاے راشدین اور ان کے تعینات کیے ہوئے صوبائی امیر انتظامی اُمور کے

---

۴۳ محمد، حمید اللہ، عہد نبوی ﷺ میں نظام حکمرانی، (مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن، بار دوم ۱۹۴۹ء)، ص ۳۵

۴۴ محمد، حمید اللہ، عہد نبوی ﷺ میں نظام حکمرانی، (مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن، بار دوم ۱۹۴۹ء)، ص ۳۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ ساتھ قاضیوں کے فرائض خود سرانجام دیتے تھے، مگر رفتہ رفتہ ہر صوبے اور ہر شہر میں عامل کے علاوہ قاضی کا تقرر ہونے لگا۔ بنواُمیہ کے دور میں بھی کم وبیش خلفائے راشدین کے دور کی طرح ہی نظامِ عدل قائم رہا، بعد میں چند تبدیلیاں بھی آئیں۔ ڈاکٹر حمید الدین کے بقول:

''قاضیوں کے فیصلے اسلامی شریعت کی رو سے قرار پاتے۔ اگر کوئی تنازعہ اس نوعیت کا ہوتا جس کے بارے میں قرآن اور حدیث کوئی قطعی فیصلہ نہ دیتے ہوں تو ایسے معاملات کے فیصلے قاضی اپنے اجتہاد اور علما کے مشوروں سے کرتے تھے۔ اُنہیں صرف مسلمانوں کے مقدمات سننے کا حق حاصل تھا، غیر مسلموں کے لیے علیحدہ جج اور پیشوا مقرر ہوتے تھے۔ جو اُن کے لیے اپنے مذہب اور رواج کے مطابق فیصلے کرتے۔''[۲۵]

وہ مزید لکھتے ہیں:

''قاضیوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی تھیں تاکہ وہ رشوت یا خیانت کی طرف مائل نہ ہوسکیں۔ انصاف کے علاوہ اوقاف کے مال کی نگرانی بھی قاضیوں کے فرائض میں شامل تھی۔ بنی اُمیہ کے عہد میں عدلیہ، خلافتِ راشدہ ہی کی طرح انتظامیہ سے آزاد رہی اور اس محکمہ کو صیغہ قضا کہتے تھے۔ مرکز کے علاوہ ہر صوبہ اور ہر ضلع میں عدالت قائم تھی جہاں اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے ہوا کرتے تھے۔''[۲۶]

بنواُمیہ کے زمانہ کی دو امتیازی خصوصیات ہیں۔ جن میں پہلی یہ تھی کہ اس دور میں قاضی عام طور پر اجتہاد سے کام لیتے تھے اور کسی مخصوص شخص کی تقلید نہیں کرتے تھے، ایسے ہی اُنہیں کتاب وسنت کی روشنی میں اپنی سمجھ بوجھ سے کام لینے کی پوری آزادی تھی۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ

''عدالت کا محکمہ اپنے اختیارات وفرائض میں اُموی فرمانرواؤں کے اثر سے بالکل آزاد تھا، ان کے ذاتی رجحانات کا ان پر کوئی اثر نہ تھا۔ اس زمانے میں عدالت کے فیصلے گورنروں اور خراج کے افسروں تک بلا رو رعایت نافذ کیے جاتے تھے۔ عہدِ اُموی میں قاضی کے انتخاب کے لیے ضروری تھا کہ وہ بلند سیرت، پاکباز، پرہیزگار، عالم، مجتہد اور عیوب سے مبرا ہو۔ اور عدل وانصاف کے مقابلے میں اس کو دنیا کی کسی طاقت کی کوئی پرواہ نہ ہو۔''[۲۷]

عہدِ عباسی میں بنواُمیہ کی ہی طرح قاضیوں کے اختیارات تھے۔ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے رعب داب اور عزت ومرتبہ کا یہ عالم تھا کہ اُمرا، وزرا بلکہ خلیفہ تک کو یہ جرات نہ ہوتی تھی کہ

---

[۲۵] حمید الدین، ڈاکٹر، تاریخ اسلامی (فیروز سنز لمیٹڈ، کراچی، ایڈیشن ہشتم) ص ۲۷۶ [۲۶] ایضاً

[۲۷] حسن ابراہیم، مسلمانوں کا نظم مملکت، مترجم علیم اللہ صدیقی (دار الاشاعت، فریدی بک سنٹر، کراچی) ص ۲۸۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے فیصلوں سے سرتابی کر سکے۔ غیر مسلموں کے دیوانی مقدمات ان کے اپنے مذہبی پیشوا سنتے۔ فوجداری کی صورت میں بلا تمیز رنگ و نسل، جنس و قوم، زبان، مذہب و ملت، سبھی کو حکومت کے مقرر کردہ منصفوں کے سامنے پیش ہونا پڑتا، حتیٰ کہ خلیفہ بھی کسی قسم کے ترجیحی سلوک کا نہ تو حق دار ہوتا اور نہ ہی مطالبہ کر سکتا تھا۔ عہدِ بنی عباس میں عدالتی نظام میں زبردست انقلاب آیا اور اس میں کئی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔

''اس دور میں عراق کے قاضی امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے مطابق شام اور بلادِ مغرب کے قاضی امام مالکؒ کے مذہب کے مطابق اور مصر کے قاضی امام شافعیؒ کے مذہب کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ اگر مدعی، مدعا علیہ ایسے مذہب سے تعلق رکھتے ہوتے جو عام طور پر اس شہر میں رائج نہ ہوتا تو اس وقت ان کے مقدمے کے فیصلے کے لیے قاضی کسی ایسے شخص کو نائب بنا دیتا جو اُنہی کے مذہب کا پیروکار ہوتا تھا۔'' (۳۸)

آہستہ آہستہ اس نظام کو زوال آ گیا۔ عباسی دورِ انحطاط میں عدالت کا محکمہ سیاسی اثر سے آزاد نہ تھا۔

اندلس میں عدلیہ

مسلم اسپین میں حکومت کا ہر حصہ منظم طور پر قائم تھا اور مسلمانوں کے دورِ حکومت میں اسپین علوم و فنون کا گہوارہ تھا۔ مسلمان حکمرانوں نے اسپین میں عدلیہ کے ادارے بھی مضبوط بنیادوں پر قائم کیے تھے۔ مسلم اسپین میں سب سے بڑا اور مقدس عہدہ قضا کا ہوتا تھا۔ قاضی دیوانی اور قاضی فوجداری جدا جدا ہوتے تھے۔ ان کا اجلاس عام طور پر مسجد کے دروازے پر ہوتا تھا۔ آئی اپچ برنی نے لکھا ہے:

''صرف یہی ایک عہدہ دار تھا جو تمام سلطنت میں سب سے زیادہ بااختیار ہوتا تھا اور خلیفہ تک کو اس کے فیصلے ردّ کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اسپین کا نظام عدالت اس زمانہ کے عجائبات میں سے تھا۔ پہلے قواعد بنائے جاتے تھے، پھر ان کو دارالسلطنت اور سرحدی علاقوں میں نافذ کر کے ان کا تجربہ کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ سلطنت میں نافذ کیے جاتے تھے۔ مقدمات کے فیصلے میں قطعاً دیر نہ کی جاتی تھی اور کسی سفارش یا حمایت کو فیصلے پر اثر انداز نہ ہونے دیا جاتا تھا۔ جتنے فیصلے ہوتے، وہ نہایت ہوش مندی اور انصاف پر مبنی ہوتے تھے''۔ (۳۹)

---

(۳۸) حسن ابراہیم، مسلمانوں کا نظم مملکت، ص ۲۸۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سلطنتِ دہلی میں نظامِ عدل

ہندوستان میں جب مسلمان آئے تو یہاں بھی عام طور پر وہی اسلامی قانون ان کا رہنما تھا، لیکن ہندوؤں کا تمدن چونکہ بہت قدیم اور اس ملک میں متعارف تھا، اس لیے دھرم شاستر کے احکام اور دیگر معتقدات ورواجات کا بھی خاص احترام کیا جاتا تھا۔[۵۰]

فتح سندھ کے تقریباً تین صدی بعد غزنویوں نے پنجاب میں اپنی حکومت قائم کی۔ غزنویوں نے سندھ کی عرب حکومت کی طرح دیوانی معاملات میں خود ہندوؤں کی پنچائتوں سے کام لیا۔ اور ہندو پنڈتوں کو فصلِ خصومات کا اختیار دیا جبکہ مسلمانوں کے معاملات قاضیوں سے متعلق رہے۔ نظامِ عدل کے دوسرے معاملات میں غزنویوں نے عباسیوں کی کہیں براہِ راست اور کہیں بالواسطہ پیروی کی۔

اسلامی ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی عدالتی عہدیداروں پر بڑی کڑی اور بھاری ذمہ داری عائد تھی اور قاضیوں کو خلافِ شرع فیصلہ کرنے پر موت کی سزا دی جاتی تھی۔ سلطان بحیثیت قانون کو نفاذ کرنیوالا اور سربراہِ مملکت تین طرح کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔

> ''اپنی پہلی حیثیت میں وہ 'دیوانِ قضا' کے ذریعے انصاف پروری کرتا تھا۔ دوسری حیثیت میں 'دیوانِ مظالم' کے ذریعے اور تیسری حیثیت میں وہ خود یا اس کے اعلیٰ فوجی عہدے دار فوجی عادل کی حیثیت سے باغیوں کے مقدمات سنتے تھے۔''[۵۱]

عہدِ سلاطین میں سب مسلم حکمرانوں نے اپنے اپنے طور پر عدل قائم کرنے کی کوشش کی۔ انہی میں سے سلطان التمش بھی اپنے عدل وانصاف میں مشہور تھا۔ غرض وہ سلاطینِ دہلی ہوں یا مغل حکمران، ہر کسی نے اپنے طور پر عدلیہ کے مضبوط ادارے قائم کیے اور عدلیہ کو دیگر اداروں پر فوقیت دی۔

انصاف ہمیشہ مسلمان بادشاہوں کا شعار رہا ہے۔ شہنشاہ جہانگیر نے تختِ نشینی کے بعد پہلا حکم جو دیا وہ 'زنجیرِ عدل' باندھنے کا تھا تا کہ مظلوموں اور ستم رسیدوں کی دادخواہی وانصاف رسانی

---

(۴۹) برنی، ائی ایچ، مسلم اسپین وثقافتی تاریخ (کفایت اکیڈمی، کراچی) ص ۵۴۶

(۵۰) خان، میر باسط علی، تاریخ عدالت آصفی، ص ۲۱

(۵۱) قریشی، اشتیاق حسین، سلطنتِ دہلی کا نظم حکومت، ترجمہ ہلال احمد زبیری (شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی) طبع اوّل، ص ۱۵۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اگر عہدیدارانِ عدالت کوتاہی وغفلت کریں تو مظلوم خود اس زنجیر کے پاس پہنچ کر اسے ہلا دے۔(۵۴) یہ زنجیر مظلوم کی دسترس میں تھی اور اس کو ہاتھ لگتے ہی گھنٹیاں بجتیں جن کی آواز بادشاہ تک پہنچتی اور فوراً مظلوم کی دادرسی کی جاتی۔

عالمگیر نے تمام اُمرا، وزرا اور سرداروں کے مقابلے میں قاضیوں اور عالموں کا مرتبہ اس قدر بڑھا دیا اور اُنہیں اس قدر اختیارات دے دیئے کہ سلطنت کے بڑے بڑے ارکان ان سے رشک وحسد کرنے لگے۔

عالمگیر کی دین داری، رعیت پروری اور عدل گستری کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اس نے تمام سلطنتِ مغلیہ میں یہ اعلان کردیا کہ جس کسی کو بادشاہ کے خلاف کوئی شکایت یا شرعی دعویٰ ہو، وہ بادشاہی وکیل سے رجوع کرکے اپنا معاملہ صاف کرے۔ اس کے علاوہ جو لوگ کسی مجبوری کے سبب دارالحکومت میں پہنچنے سے معذور تھے، ان کی سہولت کے لیے شہری وکیل مقرر کردیئے گئے۔(۵۵)

غیر جانبداری: مغلیہ دور میں عدل وانصاف کرنے میں غیر جانبداری سے کام لیا جاتا۔ نظریاتی حوالوں اور شاہانِ مغلیہ کے اقوال کے علاوہ بھی کئی مؤرخین نے کہا ہے کہ مغل حکمران غیر جانبداری سے انصاف کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بلارو ورعایت عدل گستری کے فرائض انجام دیئے۔ اکبر کے ایک منظورِ نظر گورنر (خان اعظم مرزا عزیز) کے ایک مقدمے میں عام عدالت نے فیصلہ کیا اور گورنر کو ایک کثیر رقم بطورِ خون بہا ادا کرنی پڑی۔ عدالت میں کسی کے ساتھ امتیازی سلوک روا نہ رکھا جاتا تھا اور امیر غریب سب کے ساتھ مساوی سلوک ہوتا تھا۔

برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کی حکومت صدیوں تک قائم رہی اور ابتداے عہد سے انگریزی حکومت کے قائم ہونے تک مسلمان فرمانرواؤں کا نظامِ عدل کارفرما رہا۔ ملکی نظم ونسق کے ساتھ عدل وانصاف کا محکمہ خاص توجہ کا مرکز تھا اور ان کے عدل وانصاف کے بعض واقعات اب بھی زبان زدِ خاص وعام ہیں۔

الغرض مسلم دورِ حکومت میں اسلامی شریعت کے اَحکام کا اطلاق ہوتا تھا اور خلیفہ ریاست کا سربراہ ہونے کے باوجود کسی قسم کے ترجیحی سلوک کا نہ تو حق دار ہوتا اور نہ ہی مطالبہ کرسکتا تھا۔ بلکہ اکثر اوقات خلیفہ وقت کو قاضی کی عدالت میں حاضر ہوکر کسی معاملے میں صفائی پیش کرنا پڑتی تھی اور صرف عادل اور نیک لوگوں کی شہادت قبول کی جاتی تھی۔ (جاری ہے)

---

(۵۴) خان، میر باسط علی، تاریخ عدالت آصفی، ص ۲۰ (۵۵) ایضاً ص ۵۰۵

© rasailojaraid.com